خلافت اور ملوکیت کا فرق

(سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کی کتاب میں سے چند اقتباس)

اداریہ / سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

مسلمانوں کا خلافتِ راشدہ جیسے بے نظیر مثالی نظام کی نعمت سے محروم ہو جانا کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا جو اچانک بلا سبب رونما ہو گیا ہو، بلکہ اس کے کچھ اسباب تھے اور وہ بتدریج امت کو دھکیلتے ہوئے خلافت سے ملوکیت کی طرف لے گئے۔ اس المناک تغیر کے دوران میں جتنے مراحل پیش آئے ان میں سے ہر مرحلے پر اس کو روکنے کے امکانات موجود تھے مگر امت کی اور درحقیقت پوری نوع انسانی کی یہ بدقسمتی تھی کہ تغیر کے اسباب بہت زیادہ طاقت ور ثابت ہوئے، حتیٰ کہ ان امکانات میں سے کسی ایک کا فائدہ بھی نہ اٹھایا جا سکا۔

اب ہمیں اس سوال پر بحث کرنی ہے کہ خلافت اور ملوکیت کے درمیان اصل فرق کیا تھا، ایک چیز کی جگہ دوسری چیز کے آ جانے سے حقیقت میں کیا تغیر واقع ہوا اور اس کے کیا اثرات مسلمانوں کی اجتماعی زندگی پر مرتب ہوئے۔

۱۔ تقرر خلیفہ کے دستور میں تبدیلی

اولین بنیادی تبدیلی اس دستوری قاعدے میں ہوئی جس کے مطابق کسی شخص کو امت کا سربراہ بنایا جاتا تھا۔ خلافتِ راشدہ میں وہ قاعدہ یہ تھا کہ کوئی شخص خود خلافت حاصل کرنے کیلئے نہ اٹھے اور اپنی سعی و تدبیر سے برسرِ اقتدار نہ آئے۔ بلکہ لوگ جس کو امت کی سربراہی کے لئے موزوں سمجھیں، اپنے مشورے سے اقتدار اس کے سپرد کر دیں۔ بیعت اقتدار کا نتیجہ نہیں اس کا سبب ہو۔ بیعت حاصل ہونے میں آدمی کی اپنی کوشش یا سازش کا قطعاً کوئی دخل نہ ہو۔ لوگ بیعت کرنے یا نہ کرنے کے معاملہ میں پوری طرح آزاد ہوں۔ اور جب تک کسی کو لوگوں کی آزادانہ رضامندی سے بیعت حاصل نہ ہو جائے وہ برسرِ اقتدار نہ آئے۔

خلفائے راشدین میں سے ہر ایک اسی قاعدے کے مطابق برسرِ اقتدار آیا تھا۔ ان میں سے کسی نے بھی خود خلافت لینے کی برائے نام بھی کوشش نہ کی تھی، بلکہ جب خلافت ان کو دی گئی تب انہوں نے اس کو لیا۔ سیدنا علیؓ کے متعلق اگر کوئی شخص زیادہ سے زیادہ کچھ کہہ سکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو خلافت کیلئے اہل سمجھتے تھے۔ لیکن کسی قابلِ اعتبار تاریخی روایت سے ان کے متعلق یہ بات ثابت نہیں ہوتی کہ انہوں نے خلافت حاصل کرنے کیلئے کبھی کسی درجہ میں کوئی ادنیٰ سی کوشش بھی کی ہو۔ لہٰذا ان کا محض اپنے آپ کو اہل سمجھنا اس قاعدے کے خلاف قرار نہیں دیا جا سکتا۔ درحقیقت چاروں خلفاء اس معاملہ میں بالکل یکساں تھے کہ ان کی خلافت دی ہوئی خلافت تھی نہ کہ لی ہوئی خلافت۔

ملوکیت کا آغاز اسی قاعدے کی تبدیلی سے ہوا۔ حضرت امیر معاویہؓ کی خلافت اس نوعیت کی خلافت نہ تھی کہ مسلمانوں کے بنانے سے وہ خلیفہ بنے ہوں اور اگر مسلمان ایسا کرنے پر راضی نہ ہوتے تو وہ نہ بنتے۔ وہ بہرحال خلیفہ ہونا چاہتے تھے، انہوں نے لڑ کر خلافت حاصل کی، مسلمانوں کے راضی ہونے پر ان کی خلافت کا انحصار نہ تھا۔ لوگوں نے ان کو خلیفہ نہیں بنایا، وہ خود اپنے زور سے خلیفہ بنے، اور جب وہ خلیفہ بن گئے تو لوگوں کیلئے بیعت کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا۔ اس وقت اگر ان سے بیعت نہ کی جاتی تو اس کا نتیجہ یہ نہ ہوتا کہ وہ اپنے حاصل کردہ منصب سے ہٹ جاتے بلکہ اس کے معنی خونریزی و بدنظمی کے تھے جسے امن اور نظم پر ترجیح نہیں دی جا سکتی تھی۔ اسی لیے امام حسن کی دست برداری (ربیع الاول 41ھ) کے بعد تمام صحابہؓ و تابعین اور صلحائے امت نے ان کی بیعت پر اتفاق کیا اور اس کو ''عام الجماعت'' اس بنا پر قرار دیا کہ کم از کم باہمی خانہ جنگی تو ختم ہوئی۔ حضرت امیر معاویہؓ خود بھی اس پوزیشن کو اچھی طرح سمجھتے تھے۔ اپنے زمانہ خلافت کے آغاز میں انہوں نے مدینہ طیبہ میں تقریر کرتے ہوئے خود فرمایا:

''بخدا میں تمہاری حکومت کی زمامِ کار اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اس بات سے ناواقف نہ تھا کہ تم میرے برسرِ اقتدار آنے سے خوش نہیں ہو اور اسے پسند نہیں کرتے۔ اس معاملہ میں جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اسے میں خوب جانتا ہوں، مگر میں نے اپنی اس تلوار کے زور سے تم کو مغلوب کر کے اسے لیا ہے..... اب اگر تم یہ دیکھو

کہ میں تمہارا حق پورا پورا ادا نہیں کر رہا ہوں تو تھوڑے پر مجھ سے راضی رہو"۔

اس طرح جس تغیر کی ابتدا ہوئی تھی' یزید کی ولی عہدی کے بعد سے وہ ایسا مستحکم ہوا کہ موجودہ صدی میں مصطفیٰ کمال کے ایفائے خلافت تک ایک دن کیلئے بھی اس میں تزلزل واقع نہ ہوا۔ اس سے جبری بیعت اور خاندانوں کی موروثی بادشاہت کا ایک مستقل طریقہ چل پڑا۔ اس کے بعد سے آج تک مسلمانوں کو انتخابی خلافت کی طرف پلٹنے کا کوئی موقع نصیب نہ ہو سکا۔ لوگ مسلمانوں کے آزادانہ اور کھلے مشورے سے نہیں بلکہ طاقت سے برسرِ اقتدار آتے رہے۔ بیعت سے اقتدار حاصل ہونے کی بجائے اقتدار سے بیعت حاصل ہونے لگی۔ بیعت کرنے یا نہ کرنے میں مسلمان آزاد نہ رہے۔ بیعت کا حاصل ہونا اقتدار پر قابض ہونے اور قابض رہنے کیلئے شرط نہ رہا۔ لوگوں کی اول تو یہ مجال نہ تھی کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آیا ہوا تھا اس کے ہاتھ پر بیعت نہ کرتے۔ لیکن اگر وہ بیعت نہ بھی کرتے تو اس کا نتیجہ ہرگز یہ نہ ہوتا تھا کہ جس کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا ہو وہ ان کے بیعت نہ کرنے کی وجہ سے ہٹ جائے۔

یہاں یہ بحث بالکل غیر متعلق ہے کہ مسلمانوں کی آزادانہ مشاورت کے بغیر جو خلافت یا امارت بزور قائم ہو گئی ہو وہ آئینی طور پر منعقد ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اصل سوال منعقد ہونے یا نہ ہونے کا نہیں' بلکہ یہ ہے کہ اسلام میں نصبِ خلافت کا صحیح طریقہ آیا وہ ہے جس سے خلفائے راشدین خلیفہ ہوئے یا وہ جس سے حضرت امیر معاویہ اور ان کے بعد کے لوگ خلیفہ بنے؟ ایک طریقہ کسی کام کے کرنے کا وہ ہے جس کی اسلام نے ہم کو ہدایت دی ہے۔ دوسرا طریقہ اسی کام کے کرنے کا وہ ہے جس کے مطابق اگر وہ کام کر ڈالا جائے تو اسلام اسے برداشت کر لینے کی ہمیں صرف اس لیے تلقین کرتا ہے کہ اسے مٹانے اور بدلنے کی کوشش کہیں اس سے بھی زیادہ بدتر حالات پیدا نہ کر دے۔ بڑا ظلم کرے گا وہ شخص جو ان دونوں کو ایک درجے میں رکھ دے اور دعویٰ کرے کہ اسلام میں یہ دونوں طریقے یکساں جائز ہیں۔ ایک محض جائز نہیں بلکہ عین مطلوب ہے۔ دوسرا اگر جائز ہے تو قابلِ برداشت ہونے کی حیثیت سے ہے نہ کہ پسندیدہ اور مطلوب ہونے کی حیثیت سے۔

۲۔ خلفاء کے طرزِ زندگی میں تبدیلی

دوسری نمایاں تبدیلی یہ تھی کہ دورِ ملوکیت کے آغاز ہی سے بادشاہ قسم کے خلفاء نے قیصر و کسریٰ کا سا طرزِ زندگی اختیار کر لیا اور اس طریقے کو چھوڑ دیا جس پر نبی ﷺ اور چاروں خلفائے راشدین زندگی بسر کرتے تھے۔ انہوں نے شاہی محلات میں رہنا شروع کر دیا۔ شاہی حرص (Bodyguard) ان کے محلوں کی حفاظت کرنے اور ان کے جلو میں چلنے لگے۔ حاجب و دربان ان کے اور عوام کے درمیان حائل ہو گئے۔ رعیت کا براہِ راست ان تک پہنچنا اور ان کا خود رعیت کے درمیان رہنا سہنا اور چلنا پھرنا بند ہو گیا۔ اپنی رعیت کے حالات معلوم کرنے کیلئے وہ اپنے ماتحت کارپردازوں کے محتاج ہو گئے جن کے ذریعہ سے کبھی کسی حکومت کو بھی صحیح صورتِ احوال کا علم نہیں ہو سکا ہے۔ اور رعیت کیلئے بھی یہ ممکن نہ رہا کہ بلا توسط ان تک اپنی حاجات اور شکایات لے کر جا سکیں۔ یہ طرزِ حکومت اس طرز کے بالکل برعکس تھا جس پر خلفائے راشدین حکومت کرتے تھے۔ وہ ہمیشہ عوام کے درمیان رہے جہاں ہر شخص ان سے آزادی کے ساتھ مل سکتا تھا۔ وہ بازاروں میں چلتے پھرتے تھے اور ہر شخص ان کا دامن پکڑ سکتا تھا۔ وہ پانچوں وقت عوام کے ساتھ انہی کی صفوں میں نمازیں پڑھتے تھے اور جمعہ کے خطبوں میں ذکر اللہ اور تعلیم دین کے ساتھ ساتھ اپنی حکومت کی پالیسی سے بھی عوام کو آگاہ کرتے تھے اور اپنی ذات اور اپنی حکومت کے خلاف عوام کے ہر اعتراض کی جواب دہی بھی کرتے تھے۔ اس طریقے کو حضرت علیؓ نے کوفے میں اپنی جان کا خطرہ مول لے کر بھی آخری وقت تک نبھایا۔ لیکن ملوکیت کا دور شروع ہوتے ہی اس نمونے کو چھوڑ کر روم و ایران کے بادشاہوں کا نمونہ اختیار کر لیا گیا۔ اس تبدیلی کی ابتدا حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ بعد میں یہ برابر بڑھتی ہی چلی گئی۔

۳۔ بیت المال کی حیثیت میں تبدیلی

تیسری اہم تبدیلی بیت المال کے متعلق خلفاء کے طرزِ عمل میں رونما ہوئی۔ بیت المال کا اسلامی تصور یہ تھا کہ وہ خلیفہ اور اس کی حکومت کے پاس اللہ اور خلق کی امانت ہے جس میں کسی کو من مانے طریقے پر تصرف کرنے کا حق نہیں ہے۔ خلیفہ نہ اس کے اندر قانون کے خلاف کوئی چیز داخل کر سکتا ہے نہ قانون کے خلاف اس میں سے کچھ خرچ کر سکتا ہے۔ وہ ایک ایک پائی کی آمد اور خرچ کیلئے جواب دہ ہے اور اپنی ذات کیلئے وہ صرف اتنی تنخواہ لینے کا حق دار ہے جتنی ایک اوسط درجے کی زندگی بسر کرنے کیلئے کافی ہو۔

دورِ ملوکیت میں بیت المال کا یہ تصور اس تصور سے بدل گیا کہ خزانہ بادشاہ اور شاہی خاندان کی ملک ہے' رعیت بادشاہ کی محض باجگزار ہے اور کسی کو حکومت سے

حساب پوچھنے کا حق نہیں ہے۔اس دور میں بادشاہوں اور شہزادوں کی' بلکہ ان کے گورنروں اور سپہ سالاروں تک کی زندگی جس شان سے بسر ہوتی تھی وہ بیت المال میں بے جا تصرف کے بغیر کسی طرح ممکن نہ تھی۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے زمانہ میں جب شہزادوں اور امراء کی ناجائز املاک کا محاسبہ کیا اس وقت انہوں نے خود اپنی 40 ہزار دینار سالانہ کی جائیداد جو انہیں اپنے والد عبدالعزیز بن مروان سے میراث میں ملی تھی' بیت المال کو واپس کی۔اس جائیداد میں فدک بھی شامل تھا جو نبی کریم ﷺ کے بعد تمام خلفاء کے زمانہ میں بیت المال کی ملک رہا تھا اور حضرت ابوبکر صدیقؓ نے اسے حضور ﷺ کی میراث میں آپ ﷺ کی صاحبزادی کو دینے سے انکار کر دیا تھا۔مگر مروان بن الحکم نے اپنے زمانہ خلافت میں اسے اپنی ملک اور اپنی اولاد کی میراث بنایا۔

یہ تو تھا بیت المال سے خرچ کے معاملہ میں ان حکمرانوں کا طرزِ عمل۔اب بیت المال کی آمدنی کو دیکھیے تو نظر آتا ہے کہ اس کے بارے میں بھی حلال وحرام کی تمیز ان کے ہاں اٹھتی چلی گئی۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اپنے ایک فرمان میں ان ناجائز ٹیکسوں کی ایک فہرست دی ہے جو ان کے پیش رو شاہانِ بنی امیہ کے زمانے میں رعایا سے وصول کیے جاتے تھے۔اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے بیت المال کی آمدنی کے بارے میں شریعت کے قواعد کو کس بری طرح توڑنا شروع کر دیا تھا۔

اس سلسلے میں سب سے بڑا ظلم یہ تھا کہ جو غیر مسلم اسلام قبول کر لیتے تھے ان پر بھی اس بہانے جزیہ لگا دیا جاتا تھا کہ یہ محض جزیے سے بچنے کیلئے ایمان لا رہے ہیں حالانکہ اصل وجہ اس فعل کی یہ تھی کہ اشاعتِ اسلام سے ان کو بیت المال کی آمدنی کم ہو جانے کا خطرہ تھا۔ابنِ تاثیر کی روایت ہے کہ حجاج بن یوسف (عراق کے وائسرائے) کو اس کے عاملوں نے لکھا کہ ذمی کثرت سے مسلمان ہو ہو کر بصرہ وکوفہ آباد ہو رہے ہیں اور اس سے جزیہ وخراج کی آمدنی گھٹ رہی ہے۔اس پر حجاج نے فرمان جاری کیا کہ ان لوگوں کو شہروں سے نکالا جائے اور ان پر حسب سابق جزیہ لگایا جائے۔اس حکم کی تعمیل میں جب یہ نومسلم بصرہ وکوفہ سے نکالے جا رہے تھے تو وہ یا محماہ' یا محماہ پکار پکار کر روتے جاتے تھے اور ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کہاں جا کر اس ظلم کی فریاد کریں۔اس صورتِ حال پر بصرہ وکوفہ کے علماء وفقہاء چیخ اٹھے اور جب یہ نومسلم روتے پیٹتے شہروں سے نکلے تو علماء وفقہاء بھی ان کے ساتھ روتے جاتے تھے۔حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ جب خلیفہ ہوئے تو خراسان سے ایک وفد نے آ کر شکایت کی کہ ہزار ہا آدمی مسلمان ہوئے تھے' سب پر جزیہ لگا دیا گیا ہے اور گورنر کے تعصب کا یہ حال ہے کہ وہ علانیہ کہتا ہے ''اپنی قوم کا ایک آدمی مجھے دوسرے سو آدمیوں سے زیادہ عزیز ہے''۔اسی بنیاد پر حضرت موصوف نے الجراح بن عبداللہ الحکمی کو خراسان کی گورنری سے معزول کیا اور اپنے فرمان میں لکھا کہ ''اللہ تعالیٰ نے محمد ﷺ کو داعی بنا کر بھیجا تھا نہ کہ تحصیلدار''۔

۴۔آزادیٔ اظہار رائے کا خاتمہ

اس دور کے تغیرات میں سے ایک اور اہم تغیر یہ تھا کہ مسلمانوں سے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی آزادی سلب کر لی گئی۔حالانکہ اسلام نے اسے مسلمانوں کا صرف حق ہی نہیں بلکہ فرض قرار دیا تھا اور اسلامی معاشرہ وریاست کا صحیح راستے پر چلنا اس پر منحصر تھا کہ قوم کا ضمیر زندہ اور اس کے افراد کی زبانیں آزاد ہوں۔ہر غلط کام پر وہ بڑے سے بڑے آدمی کو ٹوک سکیں اور حق بات برملا کہہ سکیں۔خلافتِ راشدہ میں لوگوں کو یہ آزادی پوری طرح محفوظ تھی۔خلفائے راشدین اس کی نہ صرف اجازت دیتے تھے بلکہ اس پر لوگوں کی ہمت افزائی کرتے تھے۔ان کے زمانہ میں حق بات کہنے والے ڈانٹ اور دھمکی سے نہیں تعریف وتحسین سے نوازے جاتے تھے اور تنقید کرنے والوں کو دبایا نہیں جاتا تھا بلکہ ان کو معقول جواب دے کر مطمئن کرنے کی کوشش کی جاتی تھی۔لیکن دورِ ملوکیت میں ضمیروں پر قفل چڑھا دیئے گئے اور زبانیں بند کر دی گئیں۔اب قاعدہ یہ ہو گیا کہ منہ کھولو تو تعریف کیلئے کھولو' ورنہ چپ رہو اور اگر تمہارا ضمیر ایسا ہی زوردار ہے کہ تم حق گوئی سے باز نہیں رہ سکتے تو قید اور قتل اور کوڑوں کی مار کیلئے تیار ہو جاؤ۔چنانچہ جو لوگ بھی اس دور میں حق بولنے اور غلط کاریوں پر ٹوکنے سے باز نہ آئے ان کو بدترین سزائیں دی گئیں تاکہ پوری قوم دہشت زدہ ہو جائے۔

۵۔عدلیہ کی آزادی کا خاتمہ

قضا (Judiciary) کی انتظامیہ سے آزادی کا اصول بھی اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں میں سے تھا۔خلافتِ راشدہ میں قاضیوں کا تقرر اگرچہ خلفاء ہی کرتے تھے مگر جب کوئی شخص قاضی مقرر ہو جاتا تھا تو اس پر اللہ کے خوف اور اس کے اپنے علم وضمیر کے سوا کسی کا دباؤ نہ رہتا تھا۔کوئی بڑے سے بڑا شخص بھی عدالت کے کام میں دخل دینے کی جرأت نہ کر سکتا تھا۔حتیٰ کہ قاضی خود خلیفہ کے خلاف فیصلہ دے سکتے تھے اور دیتے تھے۔مگر جب ملوکیت آئی تو بالآخر یہ اصول بھی ٹوٹنا شروع ہو گیا۔جن معاملات سے ان بادشاہ قسم کے خلفاء کو سیاسی اسباب' یا ذاتی مفاد کی بنا پر دلچسپی ہوتی تھی ان میں انصاف کرنے کیلئے عدالتیں آزاد نہ رہیں۔حتیٰ کہ شہزادوں' گورنروں' قائدین اور شاہی محلات کے متوسلین تک کے خلاف مقدمات میں عدل کرنا مشکل ہو گیا۔یہ ایک بڑا سبب تھا اس بات کا کہ اس زمانہ میں صالح علماء بالعموم قضا کا منصب قبول

کرنے سے انکار کر دیتے تھے اور جو عالم ان حکمرانوں کی طرف سے عدالت کی کرسی پر بیٹھنے پر راضی ہو جاتا تھا' اسے لوگ شک کی نگاہ سے دیکھنے لگتے تھے۔ عدلیہ پر انتظامیہ کی دست درازی یہاں تک بڑھی کہ گورنروں کو قاضیوں کے عزل ونصب کا اختیار دے دیا گیا۔ حالانکہ خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ اختیارات خلیفہ کے سوا کسی کو حاصل نہ تھے۔

۶۔ شوروی حکومت کا خاتمہ

اسلامی ریاست کے بنیادی قواعد میں سے ایک اہم قاعدہ یہ تھا کہ حکومت مشورے سے کی جائے اور مشورہ ان لوگوں سے لیا جائے جن کے علم' تقویٰ' دیانت اور اصابتِ رائے پر امت کو اعتماد ہو۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں قوم کے بہترین لوگ ان کے مشیر تھے جو دین کا علم رکھنے والے اور اپنے علم وضمیر کے مطابق پوری آزادی کے ساتھ بے لاگ رائے دینے والے ہوتے تھے۔ پوری قوم کو ان پر یہ اعتماد تھا کہ وہ حکومت کو کبھی غلط راستے پر نہ جانے دینگے۔ یہی لوگ امت کے اہل الحل والعقد تسلیم کیے جاتے تھے مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو یہ قاعدہ بھی بدل دیا گیا۔ شوریٰ کی جگہ شخصی استبداد نے لے لی۔ حق شناس اور حق گو اہلِ علم سے بادشاہ' اور بادشاہوں سے یہ لوگ دور بھاگنے لگے۔ اب بادشاہوں کے مشیر اگر تھے تو ان کے گورنر' قائدین' شاہی خاندان کے امراء اور درباری لوگ تھے نہ کہ وہ اہل الرائے جن کی قابلیت اور دیانت وامانت پر امت کو اعتماد تھا۔

اس کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا کہ ایک بڑھتے ہوئے تمدن میں پیش آنیوالے قانونی مسائل میں فیصلہ دینے والا کوئی ایسا با اختیار ادارہ باقی نہ رہا جس کی طرف معاملات میں بروقت رجوع کیا جا سکتا ہو' جس کے اجماعی یا جمہوری فیصلے قانونِ اسلامی کے جز بن جائیں اور پھر ملک کی تمام عدالتیں انہی کے مطابق معاملات کے تصفیے کرنے لگیں۔ جہاں تک حکومت کے نظم ونسق' اہم داخلی وخارجی مسائل اور عام پالیسی کے معاملات کا تعلق تھا' یہ شاہی کونسل ان کے فیصلے تو برے یا بھلے کر سکتی تھی۔ لیکن قانونی مسائل کے فیصلے کرنا اس کے بس کا کام نہ تھا۔ اس کی جرأت اگر یہ لوگ کرتے بھی تو امت کا اجتماعی ضمیر ان کے فیصلوں کو ہضم کرنے کیلئے تیار نہ تھا۔ وہ خود بھی اپنی حیثیت کو جانتے تھے اور امت بھی ان کو فاسق وفاجر سمجھتی تھی۔ ان کا کوئی دینی واخلاقی وقار نہ تھا کہ ان کے فیصلے اسلامی قانون میں شامل ہو سکتے۔ علماء اور فقہاء نے اس خلا کو پر کرنے کی کوشش میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی مگر ان کی یہ کوشش انفرادی نوعیت کی تھی۔ ہر عالم اپنی درس وافتاء کی مسند سے قانونی احکام بیان کرتا تھا اور ہر قاضی اپنے علم وفہم اور اپنے اجتہاد کے مطابق' یا کسی دوسرے عالم کے فتوے کی بنا پر' جس چیز کو بھی قانون سمجھتا تھا اس کے مطابق فیصلے کر دیتا تھا۔ اس سے قانون کے تسلسل وارتقاء میں تو انقطاع واقع نہ ہوا۔ لیکن اسلامی مملکت میں ایک قانونی انارکی پیدا ہو گئی۔ پوری ایک صدی تک امت کے پاس کوئی ایسا ضابطہ نہ تھا جسے سند کی حیثیت حاصل ہوتی اور مملکت کی تمام عدالتیں اس کی پیروی کر کے جزئیاتِ مسائل میں یکساں فیصلے کر سکتیں۔

۷۔ نسلی اور قومی عصبیتوں کا ظہور

ایک اور عظیم تغیر جو اس دورِ ملوکیت میں رونما ہوا وہ یہ تھا کہ اس میں قوم' نسل' وطن اور قبیلہ کی وہ تمام جاہلی عصبیتیں پھر سے ابھر آئیں جنہیں اسلام نے ختم کر کے اللہ کا دین قبول کرنے والے تمام انسانوں کو یکساں حقوق کے ساتھ ایک امت بنایا تھا۔ بنی امیہ کی حکومت ابتدا ہی سے ایک عرب حکومت کا رنگ لیے ہوئے تھی جس میں عرب مسلمانوں کے ساتھ غیر عرب نومسلموں کے مساوی حقوق کا تصور قریب قریب مفقود تھا۔ اس میں اسلامی احکام کی صریح خلاف ورزی کرتے ہوئے نومسلمانوں پر جزیہ لگایا گیا۔ اس سے نہ صرف اشاعتِ اسلام میں شدید رکاوٹ پیدا ہوئی بلکہ عجمیوں میں یہ احساس پیدا ہو گیا کہ اسلامی فتوحات نے دراصل ان کو عربوں کا غلام بنا دیا ہے اور اب وہ اسلام قبول کر کے بھی ان کے برابر نہیں ہو سکتے۔ پھر یہ خرابی اور آگے بڑھی۔ والی' قاضی حتیٰ کہ امامِ نماز مقرر کرتے ہوئے بھی یہ دیکھا جانے لگا کہ آدمی عرب ہے یا غیر عرب۔ کوفے میں حجاج بن یوسف نے حکم دے رکھا تھا کہ عرب کے سوا کوئی شخص نماز میں امام نہ بنایا جائے۔ حضرت سعید بن جبیر جب گرفتار ہو کر آئے تو حجاج نے ان پر احسان جتایا کہ میں نے تم کو امامِ نماز بنایا' حالانکہ یہاں عرب کے سوا کوئی امامت نہ کرا سکتا تھا۔ عراق میں نبطیوں کے ہاتھوں پر مہریں لگائی گئیں۔ بصرے سے نومسلم عجمیوں کا وسیع پیمانے پر اخراج کیا گیا۔ حضرت سعید بن جبیر جیسے بلند مرتبہ عالم کو جن

کے پائے کے آدمی اس وقت دنیائے اسلام میں دو چار سے زیادہ نہ تھے' جب کوفے کا قاضی مقرر کیا گیا تو شہر میں شور مچ گیا کہ عرب کے سوا کوئی شخص قضا کا اہل نہیں ہوسکتا۔ آخر کار حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ کے صاحبزادے ابوبردہ کو قاضی بنایا گیا اور ان کو حکم دیا گیا کہ ابنِ جبیر سے مشورہ لیے بغیر کوئی فیصلہ نہ کریں۔ حد یہ ہے کہ جنازوں پر بھی کسی عجمی کو نماز پڑھانے کے لیے آگے نہ کیا جاتا' اِلّا یہ کہ کوئی عرب لڑکا تک جنازہ پڑھانے کیلئے موجود نہ ہو۔

یہی وہ طرزِ عمل تھا جس نے عجم میں شعوبیت (عجمی قوم پرستی) کو جنم دیا اور اسی کی بدولت خراسان میں بن امیہ کے خلاف عباسیوں کی دعوت کو فروغ نصیب ہوا۔ عجمیوں میں عربوں کے خلاف جو نفرت پیدا ہو چکی تھی' عباسی داعیوں نے اسے بنی امیہ کے خلاف استعمال کیا اور انہوں نے اس امید پر عباسیوں کا ساتھ دیا کہ ہمارے ذریعہ سے انقلاب ہوگا تو ہم عربوں کا زور توڑ سکیں گے۔

بنی امیہ کی یہ پالیسی صرف عرب و عجم کے معاملے ہی تک محدود نہ تھی بلکہ خود عربوں میں بھی اس نے سخت قبائلی تفریق برپا کر دی تھی۔ عدنانی اور قحطانی' یمانی اور مضری' اَزد اور تمیم' کلب اور قیس کے تمام پرانے جھگڑے اس دور میں پھر سے تازہ ہو گئے۔ حکومت خود قبیلوں کو ایک دوسرے کے خلاف استعمال کرتی تھی اور اس کے عرب گورنر اپنی اپنی ولایتوں میں پورے تعصب کے ساتھ اپنے قبیلے کو نوازتے اور دوسرے قبیلوں کے ساتھ بے انصافیاں کرتے تھے۔ خراسان میں اسی پالیسی کی وجہ سے یمنی اور مضری قبائل کی کشمکش اس حد تک بڑھی کہ عباسی داعی ابومسلم خراسانی نے ان دونوں کو ایک دوسرے کے خلاف لڑا کر اموی سلطنت کا تختہ الٹ دیا۔ حافظ ابنِ کثیر البدایہ والنہایہ میں ابنِ عساکر کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ جس زمانہ میں عباسی فوجیں دمشق پر چڑھی چلی جا رہی تھیں اس وقت بنی امیہ کے دارالسلطنت میں یمانی اور مضری کی عصبیت پوری شدت کے ساتھ بھڑکی ہوئی تھی حتیٰ کہ ہر مسجد میں دو محرابیں الگ الگ تھیں اور جامع مسجد میں دو منبروں پر دو امام خطبے دیتے اور دو جماعتوں کی الگ الگ امامت کراتے تھے۔ ان دونوں گروہوں میں سے کوئی کسی کے ساتھ نماز تک پڑھنے کیلئے تیار نہ تھا۔

۸۔ قانون کی بالاتری کا خاتمہ

سب سے بڑی مصیبت جو ملوکیت کے دور میں مسلمانوں پر آئی وہ یہ تھی کہ اس دور میں قانون کی بالاتری کا اصول توڑ دیا گیا' حالانکہ وہ اسلامی ریاست کے اہم ترین بنیادی اصولوں میں سے تھا۔

اسلام جس بنیاد پر دنیا میں اپنی ریاست قائم کرتا ہے وہ یہ ہے کہ شریعت سب پر بالا ہے۔ حکومت اور حکمراں' راعی اور رعیت' بڑے اور چھوٹے' عوام اور خواص سب اس کے تابع ہیں۔ کوئی اس سے آزاد یا مستثنیٰ نہیں اور کسی کو اس سے ہٹ کر کام کرنے کا حق نہیں۔ دوست ہو یا دشمن' حربی کافر ہو یا معاہد' مسلم رعیت ہو یا ذمی' مسلمان وفادار ہو یا باغی یا برسرِ جنگ' غرض جو بھی ہو شریعت میں اس سے برتاؤ کرنے کا ایک طریقہ مقرر ہے جس سے کسی حال میں تجاوز نہیں کیا جا سکتا۔

خلافتِ راشدہ اپنے پورے دور میں اس قاعدے کی سختی کے ساتھ پابند رہی' حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ نے انتہائی نازک اور سخت اشتعال انگیز حالات میں بھی حدودِ شرع سے قدم باہر نہ رکھا۔ ان راست رو خلفاء کی حکومت کا امتیازی وصف یہ تھا کہ وہ ایک حدود آشنا حکومت تھی نہ کہ مطلق العنان حکومت۔

مگر جب ملوکیت کا دور آیا تو بادشاہوں نے اپنے مفاد' اپنی سیاسی اغراض' اور خصوصاً اپنی حکومت کے قیام و بقاء کے معاملہ میں شریعت کی عائد کی ہوئی کسی پابندی کو توڑ ڈالنے اور اس کی باندھی ہوئی کسی حد کو پھاند جانے میں تامل نہ کیا۔ اگرچہ ان کے عہد میں بھی مملکت کا قانون اسلامی قانون ہی رہا۔ کتاب اللہ و سنتِ رسول اللہ ﷺ کی آئینی حیثیت کا ان میں سے کسی نے کبھی انکار نہیں کیا۔ عدالتیں اسی قانون پر فیصلے کرتی تھیں اور عام حالات میں سارے معاملات شرعی احکام ہی کے مطابق انجام دیئے جاتے تھے لیکن ان بادشاہوں کی سیاست دین کے تابع نہ تھی۔ اس کے تقاضے وہ ہر جائز و ناجائز طریقے سے پورے کرتے تھے اور اس معاملہ میں حلال و حرام کی تمیز روا نہ رکھتے تھے۔

یہ ہے مختصر روداد ان چند بڑے تغیرات کی جو خلافتِ راشدہ کی جگہ ملوکیت کے آجانے سے رونما ہوئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ امت اور اس کی رائے کو نظر انداز کر کے کسی شخص' خاندان یا گروہ کا اپنے اقتدار کیلئے کوشاں ہونا اور زبردستی اسے قائم کرنا کیا نتائج پیدا کرتا ہے۔ اس غلطی کی ابتدا کرتے وقت

چاہے اسے یہ شعور بھی نہ ہو کہ اس کا اقدام یہ نتائج پیدا کرے گا اور اس کی نیت ہرگز یہ نہ ہو کہ یہ نتائج اس سے برآمد ہوں' لیکن بہرحال یہ اس کے فطری نتائج ہیں جو رونما ہو کر رہتے ہیں۔

قائدِ اعظم کا پاکستان اور موجودہ ملکی حالات

.....محمد عبدالرحمٰن

برصغیر ہند پر قریباً سات سو برس مسلمان حکمران رہے اور برطانوی سامراج کے ہاتھوں اس وقت مغلوب ہوئے جب میر صادق اور میر جعفر جیسے غداروں نے ذاتی مفادات کی خاطر برطانوی حملہ آوروں کے ساتھ خفیہ تعاون کیا اور ٹیپو سلطان جیسے بہادر سپہ سالار کو شکست سے دوچار کیا اور یوں مسلمانوں کو حکمرانی کی جگہ تخت برطانیہ کی غلامی کا طوق گلے میں ڈالنا پڑا جو کئی صدیوں جاری رہا۔ جنگِ عظیم کی تباہی نے برطانوی سامراج کو بڑی حد تک کمزور کر دیا تو مغلوب اقوام میں بھی آزادی کے جذبات نے پنپنا شروع کیا۔ ہندوستان میں ایسا ہی ماحول بنا تو ہندو اکثریت نے بھی پورے ہندوستان پر حکمرانی اپنا حق سمجھ لیا۔ انہی دنوں حضرت اقبالؒ نے مسلمانوں کیلئے ایک الگ ریاست کا خواب دیکھا اور 23 مارچ 1940ء لاہور میں مسلم عمائدین کے سامنے ہندوستان کی تقسیم سے ایک آزاد اسلامی ریاست کا نظریہ پیش کر دیا اور پھر اسی نظریہ کو عملی شکل میں ڈھالنے کیلئے برطانیہ میں مقیم قائداعظم محمد علی جناح کو ایک خط کے ذریعے تحریک پاکستان کی قیادت سنبھالنے کا مشورہ دیا جسے آپؒ نے بخوشی قبول کر لیا اور وکالت چھوڑ کر ہندوستان تشریف لائے۔ مسلسل سات برس تک ہندوستانی مسلمانوں کو قیامِ پاکستان کی اہمیت سمجھاتے اور ان میں جدوجہد آزادی کا ولولہ پیدا کرتے رہے اور برطانوی حکمرانوں اور ہندو برہمنوں کی بھرپور مخالفت کے باوجود اپنے ارادوں پر ڈٹے رہے۔ ان دنوں کے سیاسی احوال کے بارے ہندوستان پر مقرر برطانوی حکمران یعنی وائسرائے ہند لارڈ ماؤنٹ بیٹن اپنی ڈائری میں لکھتے ہیں کہ ''مجھے ہندوستان کو برطانوی راج سے آزاد کرنے اور وہاں سے برطانوی شہریوں اور اثاثوں کی برطانیہ منتقلی کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مسلمانوں کیلئے پاکستان نامی ریاست چونکہ برطانوی حکومت کو بھی نامنظور تھی اس لیے میں نے ایک روز محمد علی جناحؒ کو اپنے دفتر طلب کیا اور اس کے سامنے دو اختیار رکھے۔ ایک یہ کہ اگر وہ ہندوستان کی تقسیم کی ضد چھوڑ دے تو اسے پورے ہندوستان کا گورنر جنرل یا صدر تسلیم کر لیا جائے گا اور دوسرا یہ کہ اگر اس نے قیامِ پاکستان کی ضد نہ چھوڑی تو قتل کر دیا جائے گا۔ محمد علی جناح نے پہلے اختیار کا انکار کیا اور دوسرے کے بارے میں مجھے کہا کہ میں قتل کیلئے حاضر ہوں لیکن یاد رکھنا اگر تم نے مجھے قتل کروا دیا تو تم بھی وہ کام نہیں کر پاؤ گے جس کیلئے تمہیں ہندوستان بھیجا گیا ہے۔ یعنی برطانوی افراد اور اثاثوں کی بحفاظت برطانیہ منتقلی۔ محمد علی جناح کی ذہانت اور جرأت دیکھتے ہوئے میں حیران رہ گیا کہ یہ شخص موت سے بھی نہیں ڈرتا اور میرا خفیہ مشن بھی جانتا ہے۔ چنانچہ میں سمجھ گیا کہ اس آدمی کو نہ خریدا جا سکتا ہے اور نہ ہی ڈرایا دھمکایا جا سکتا ہے۔ ہندوستان کے نامی گرامی رہنماؤں میں سے بعض نے ہمارے کہنے پر اور بعض نے دیگر مصلحتوں کی بنا پر محمد علی جناح کے عزم کے خلاف پاکستان مخالف جذبات کا اظہار کیا لیکن اس کے باوجود محمد علی جناح کی سربراہی میں تحریک بھرپور انداز میں چلی اور یوں دو قومی نظریہ کی بنیاد پر برصغیر ہند مین پاکستان نامی ایک آزاد اسلامی ریاست کرۂ ارض پر نمودار ہو گئی۔

تاریخ گواہ ہے کہ اس تحریک میں مسلمانوں کو بہت زیادہ جانی و مالی نقصان اٹھانا پڑا۔ لاکھوں افراد بشمول عورتیں اور بچے شہید ہوئے اور کروڑوں افراد کو اپنے آبائی مقامات چھوڑ کر بے سروسامانی کی حالت میں پاکستان کی طرف ہجرت کرنا پڑی۔ قائداعظم نے بطور گورنر جنرل پاکستان کی سربراہی کا عہدہ سنبھالا تو انتہائی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان مشکلات نے آپ کی جسمانی کمزوری میں روز بروز اضافہ کیا لیکن اس کے باوجود آپ مختلف مقامات پر اپنے خطابات میں اہلیانِ پاکستان کو عزم و استقلال کی باتیں سمجھاتے رہے۔ ایسا ہی ایک خطاب 30 اکتوبر 1947ء کو لاہور شہر میں کیا جس میں آپؒ سے فرمایا:

''اگر ہم قرآن پاک سے الہامی و علمی رہنمائی پائیں تو آخری فتح' میں ایک بار پھر سے کہتا ہوں ہماری ہی ہوگی۔ ایک لمحہ کیلئے بھی کبھی یہ نہ سوچنا کہ تمہارے دشمن اپنے مذموم مقاصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔ لیکن اسی وقت صورتِ حال کو آسان بھی نہ لینا بلکہ بہت مشکل اور خطرناک صورتِ حال سے تمہیں واسطہ پڑے گا۔ کام کی مشکلات کے سامنے بے بسی/ لاچارگی بھی کبھی دل میں نہ لانا۔ تم خالص اور معیاری مادہ سے بنے ہو اور تمہارا کوئی متبادل نہیں۔ دیگر افراد کی طرح تم کیوں کامیاب نہیں ہو گے جیسے تمہارے آباؤ اجداد ہوئے۔ تم ایک ایسی قوم ہو جس کی تاریخ حیران کن پختہ کردار اور شجاعت کے حامل افراد سے لبریز ہے۔ اپنی ایسی روایات پر پورا اترنے کی کوشش

کرتے رہیں بلکہ ان میں کامیابی کا ایک نیا باب شامل کریں۔ میری آپ سے اور ان تمام سے جنہیں میرا یہ پیغام پہنچے درخواست ہے کہ ہر کوئی اپنے دل میں یہ عہد کرے کہ وہ پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنانے اور دنیا کی ایسی عظیم قوم بنانے کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کیلئے تیار ہے جس کا مقصد اندرونی و بیرونی امن ہے۔ اپنی اخلاقی اقدار کو بلند رکھیں اور موت سے نہ گھبرائیں۔ ہمارا دین ہمیں ہر وقت موت کا سامنا کرنے کا درس دیتا ہے۔ پاکستان اور اسلام کی بالادستی کیلئے ہمیں بہادری سے موت کا سامنا کرنا چاہیے۔ ایک مسلمان کیلئے حق کی خاطر شہادت سے بہتر اور کوئی موت نہیں۔ اگر ہم حق پر ہیں تو ہم ناکام ہو ہی نہیں سکتے۔ ہم زندہ قوم ہیں اور بحیثیت قوم ہمیں زندہ رہنا چاہیے۔ اپنا فرض خوش اسلوبی سے سرانجام دیں اور اللہ تعالیٰ پر کامل اعتماد رکھیں۔ دنیا میں ایسی کوئی طاقت نہیں جو پاکستان کا وجود ختم کر سکے۔ پاکستان زندہ باد"۔

قائداعظم کے اس خطاب سے آپ کے ذاتی کردار اور دینِ اسلام اور پاکستان کے بارے آپ کی قلبی وفکری احوال روزِ روشن کی طرح عیاں ہو جاتے ہیں۔ برصغیر ہند پر اسلام مخالف برطانوی راج اور مسلمانوں کے خلاف شدید تعصب رکھنے والے ہندو چالباز یعنی دونوں اقوام کے مسلم مخالف جارحانہ جذبات وانداز جیسے مشکل و نامساعد حالات میں اسلام کے نام پر ایک نئی ریاست کا قیام کوئی آسان کام نہ تھا جو اللہ تعالیٰ نے قائداعظم محمد علی جناحؒ کی ذات سے لیا۔ لیکن افسوس کہ آپ کے وصال کے بعد ملکی اقتدار کیلئے سیاسی رسہ کشی کا ایسا سلسلہ شروع ہوا جس نے پہلے تو ملک کو دولخت کیا اور پھر منافقانہ سیاست کے ذریعے قومی سوچ کا دھارا ہی بدل دیا۔ سیاسی میدان کے بڑے کھلاڑیوں نے قائداعظم کی بصیرت، ارشادات اور عملی زندگی کو قابلِ توجہ ہی نہ سمجھا اور نہ ہی قیامِ پاکستان کے حقیقی مقاصد کا ادراک کیا بلکہ محض اقتدار اور ذاتی مفادات کا ایک ذریعہ بنا لیا۔ اسی لیے ملکی اقتدار محض چند خاندانوں کا استحقاق سمجھا جانے لگا اور یہی وہ خاندان رہے جنہوں نے نسل در نسل اقتدار کیلئے مروجہ پارلیمانی جمہوری نظام کا حلیہ بھی بگاڑ دیا۔ یاد رہے قائداعظمؒ سے کسی نے پاکستان کے آئین کے بارے میں سوال کیا تو آپؒ نے فرمایا ہمارا آئین تو چودہ صدیاں پہلے ہی قرآن وسنت کی صورت لکھا جا چکا اب ہمیں کسی نئے آئین کی ضرورت نہیں۔ لیکن تاریخ گواہ ہے کہ بعد میں آنے والے سیاستدانوں نے ایک کے بعد دوسرا آئین لکھا اور ان اسمبلیوں سے منظور کرایا جہاں محض ایسے افراد ہی پہنچ پاتے ہیں جو مالدار ہونے کے ساتھ سب سے پہلے پارٹی بنانے والے سیاستدانوں کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلاتے ہیں اور پھر ان کے احکامات کے مطابق عمل کر کے ملکی سیاست میں کٹھ پتلیاں بنے رہتے ہیں۔ اسی لیے گزشتہ چار دہائیوں سے وہی خاندان ملکی اقتدار پر باریاں لگا رہے ہیں جن کے پاس لوٹی ہوئی دولت کے بھی انبار ہیں اور سیاسی چالبازیوں میں بھی بہت ہوشیار اور انتہائی عیار ہیں۔ اسی لیے سیاست اب عبادت نہیں بلکہ منافقت کی انتہا نظر آ رہی ہے۔ ایک دوسرے کے خلاف جو زبان استعمال کی جاتی ہ اس کی سٹرانڈ سے اسلامی تعلیمات تو کیا انسانی اقدار بھی بدبودار ہوئی جا رہی ہیں اور عصرِ حاضر کے بے لگام الیکٹرانک میڈیا نے اس بدبو کو ہر محلے اور ہر گلی تک پہنچا دیا ہے اور اس پر خاص بات یہ بھی کہ سوشل میڈیا نے جلتی پر تیل کے کام سے اسے اخلاقی گراوٹ کی انتہا تک پہنچا دیا ہے۔ اس انتہا کی بھی انتہا ہے کہ عوام کی نمائندگی کا دعویٰ کرنے والی بڑی سیاسی پارٹیوں نے جھوٹ اور فریب پر مبنی مواد تیار کرنے والے ایسے ماہرین بھاری تنخواہوں پر خفیہ ٹھکانوں پہ بٹھا رکھے ہیں جہاں سیاسی مخالفین کی کردار کشی کے ایسے ویڈیو کلپ تیار کیے جاتے ہیں جنہیں سننے دیکھنے والے بھی حیران و پریشان ہو جاتے ہیں۔ افسوس کہ یہ سب کچھ اس ملک میں ہو رہا ہے جو اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا اور جس پر حکمرانی کرنے والوں کی آئینی ذمہ داریوں کے بارے ملکی آئین کی دفعہ 31 میں درج ذیل لکھا ہے:

۱۔ پاکستانی مسلمانوں کی معاشرت اسلامی سانچے میں ڈھالنے کیلئے ایسے اقدامات کیے جائیں گے جو انہیں انفرادی اور اجتماعی سطح پر اسلام کی حقیقی تعلیمات کے بنیادی اصولوں اور ناگزیر اسلامی عقائد کے مطابق زندگیاں ڈھالنے میں معاون ہوں۔ نیز ایسی عملی تدابیر اختیار کی جائیں گی جن سے عوام قرآن وسنت کے طے کردہ اصولوں کے مطابق زندگی گزارنے کے طریقے سمجھتے ہوئے ان پر عمل پیرا ہو سکیں۔

۲۔ اس ضمن میں ریاست درج ذیل پہلوؤں پر بھرپور توجہ دے گی:

الف۔ قرآن حکیم اور اسلامیات کی تعلیم لازمی کرنا، عوام کو عربی زبان پڑھانے اور سکھانے کی حوصلہ افزائی اور سہولیات فراہم کرنا اور قرآن حکیم کے درست نسخہ جات کی پرنٹنگ اور پبلی کیشن کرنا۔

ب۔ مسلمانوں میں اتحاد قائم رکھنا اور افرادی کردار کو اسلامی اخلاقی اقدار کی مطابقت میں لانا۔

ج۔ زکوٰۃ عشر، اوقاف اور مساجد کی حفاظت کی خاطر باقاعدہ تنظیم سازی کرنا۔

غور فرمائیے کہ جس ریاست کے بانی قائد نے ملک خداداد کیلئے ایسے نیک خیالات وجذبات کا اظہار کیا ہو اور جس کا آئین بھی اسلامی دفعات پر عمل کرنے کا پابند ہو اس ریاست میں قرآن وسنت کے عملی نفاذ سے اسلامی اقدار کی روشن روایات کا اظہار تو درکنار عمومی انسانی اقدار بھی ناپید ہو جائیں کیوں؟ اس ناکامی کی پہلی ذمہ داری تو

یقیناً ان حکمرانوں پر ہے جنہوں نے طویل عرصہ تک اقتدار کی باریاں لگائیں لیکن نہ قائداعظم کی مذکور ہدایات پر کبھی دھیان دیا اور نہ ہی آئینی دفعات کا کبھی لحاظ کیا بلکہ ذاتی مفادات کی خاطر ملکی آئین کو بھی موم کی ناک بنا دیا اور پھر جب چاہا اور جیسے چاہا توڑ مروڑ دیا۔ مزید یہ کہ نہ ہی کبھی اپنے ان وعدوں کو پورا کیا جو الیکشن سے پہلے عوام کو بیوقوف بنانے کیلئے جلسے جلوسوں میں لگائے جاتے رہے۔ دوسری بڑی ذمہ داری اس ادارے پر ہے جو ملک میں عدل وانصاف قائم کرنے کا روادار ہے۔ اس ادارے کی موجودہ حالت تو یہ ہے کہ دنیا کے ایک سو اٹھائیس ملکوں میں عدل وانصاف کا جائزہ لینے والی ایک تنظیم نے مالی مراعات کے لحاظ سے پاکستانی عدلیہ کو دنیا بھر میں پانچویں نمبر پر رکھا ہے اور کارکردگی کے لحاظ سے اسے ایک سو اکیسویں نمبر پر لکھا ہے بلکہ گزشتہ دنوں ملک کی سب سے بڑی عدالت میں ہونے والے چند فیصلوں نے تو پاکستان کے عدالتی نظام ہی کو مضحکہ خیز بنا دیا ہے۔ اس لیے کہ پہلے تو محض ملکی وسائل لوٹنے والے سیاستدانوں کے مالی واخلاقی جرائم کو قانونی شقوں کی آڑ کے پیچھے چھپا کر انہیں عوامی غیض وغضب سے بچایا جاتا تھا اور اب اپنے خاندانوں کو بھی قانون سے بالاتر ٹھہرا کر مالی خیانت کا حقدار ٹھہرالیا گیا ہے۔ اسی لیے ایک غیر ملکی جریدے میں پاکستانی عدالتوں کو امیروں کی لونڈیاں (Bitches of riches) جیسے قبیح الفاظ میں پیش کیا گیا ہے اور آج سوشل میڈیا پر انتہائی شرمناک انداز میں پاکستانی عدلیہ کا مذاق اڑایا جارہا ہے۔ اسی مذاق میں پہلے مشہور تھا کہ مقدمہ بازی کیلئے بھاری فیس پر وکیل کرنے کی بجائے کیوں نہ جج ہی کرلیا جائے اور آج سرعام کہا جارہا ہے کہ مقدمے کے گواہان کے ہاتھ میں قرآن پر حلف لینے کی بجائے بہتر ہوگا کہ جج صاحبان کے ہاتھ میں قرآن پاک تھما کر بحیثیت مسلمان انہیں قرآنی احکامات کے مطابق انصاف سے فیصلے کرنے کی یاددہانی کرائی جائے۔ اس لیے کہ یہی اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور اسی میں انسانی معاشرت کی اصلاح وفلاح ہے۔ غور فرمائیے کہ سورۃ الممتحنہ 8 میں ہے کہ ''یقیناً اللہ تعالیٰ انصاف فراہم کرنے والوں کو پسند فرماتا ہے''۔ اور سورۃ النساء 58 میں ہے: ''اور جب لوگوں میں فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو''۔ لیکن ان واضح احکامات کے باوجود عدل وانصاف کے ذمہ دار اگر جانتے بوجھتے انصاف نہ کریں تو سورۃ المائدہ 44 میں انہیں کافر فرمایا گیا ہے: ''اور جو کوئی حکم نہ کرے اس کے موافق جو کہ اللہ نے اتارا ہے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں''۔ بلکہ سورۃ المائدہ 45 میں انہیں ظالم اور 47 میں فاسق بھی ٹھہرایا گیا ہے۔ ان آیات مقدسہ کی روشنی میں ملکی عدالتی احوال دیکھتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ یہاں معاملات تو کفار سے بھی بدتر ہیں۔ اس لیے کہ کافر اگر یوم آخرت' اللہ تعالیٰ کے سامنے جوابدہی پر ایمان نہیں رکھتے تو کم از کم اپنے معاشرتی حالات سدھارنے کے بارے میں ضرور سوچتے ہیں۔ لیکن افسوس کہ قرآن پاک پر حلف اٹھانے والے نہ یوم آخرت جوابدہی کے بارے میں سوچتے ہیں اور نہ معاشرتی حالات سدھارنے کی فکر کرتے ہیں۔ اس لیے آج قوم کو بہتری کی راہ دکھانے والے دانشور بھی حالات کے نوحے لکھنے پر مجبور ہیں۔ روزنامہ جنگ کے کالم نگار مظہر برلاس بعنوان ''حالات کا نوحہ'' میں لکھتے ہیں:

''پاکستانی معاشرے کے آج کے حالات ملک سے محبت کرنے والوں سے دیکھے نہیں جارہے۔ ہر طرف افراتفری ہے' بدامنی ہے' لوگوں کے مسائل میں اضافہ ہوتا جارہا ہے' کہیں بے روزگاری کا سیلاب ہے تو کہیں مہنگائی کا طوفان ہے۔ ہر طرف بے یقینی بکھری ہوئی ہے' ہر ادارے میں کرپشن کے چرچے ہیں' کرپشن کو بے نقاب کرنے والے اداروں میں بھی کرپشن کا تذکرہ ہے۔ انصاف معاشرہ سے دور ہوگیا ہے۔ ہر شعبے میں مافیاز کا راج ہے' دیانتداری چراغ لے کر ڈھونڈنا پڑتی ہے مگر اس تلاش میں اکثر دیئے بجھا دیئے جاتے ہیں۔ ہر طرف دعوے ہیں' ہر جانب وعدے ہیں' نہ کسی کو دعووں کا احساس ہے اور نہ ہی کسی کو وعدوں کا پاس ہے۔ ایسے لگتا ہے جیسے احساس مر گیا ہو' اس موت پر بھی نعرے بازی ہورہی ہے۔ سیاست چمکائی جارہی ہے اور اب تو حالات ایسے ہیں کہ لوگ رہنماؤں سے دور ہوگئے ہیں۔ جب آس کا دیا بجھ جائے تو کیا ہوسکتا ہے۔ اگر یہاں انصاف ہوتا تو کوئی کیا کسی کی زمین پر قبضہ کرتا' اگر ظلم نہ ہوتا تو مظلوموں کے ہجوم کیسے پیدا ہوں؟ کیا لکھوں جہاں تعلیم اور صحت جیسے شعبے بھی کرپشن سے آلودہ ہوجائیں۔ جہاں ارباب بست وکشا دولت کے پجاری بن جائیں۔ کیا لکھا جائے کہ جہاں عوام کیلئے فیصلے ہونا تھے وہاں رشوت کی تقسیم کی باتیں ہوتی ہیں۔ ایمانداری اور دیانتداری کے دعوے ہیں' حقیقت کے آئینے میں اس کا عکس بھی نہیں' ظلم اور جبر سے رکاوٹیں تو پیدا کی جاسکتی ہیں مگر سیلاب کا رخ نہیں موڑا جاسکتا۔ شاید اب پاکستانی سیاستدانوں کے بس سے بہت کچھ باہر ہوگیا ہے۔ بدقسمتی کہ پاکستان کی کسی بھی سیاسی جماعت کے رہنماؤں کا عوامی نبض پر ہاتھ نہیں رہا۔ سیاسی قیادت کو عوام کے مسائل کی خبر ہی نہیں اس کی دو تین بڑی وجوہات ہیں۔ چالیس پچاس سال پہلے عوامی نمائندہ بھی وہیں رہتا تھا جہاں عام لوگ رہتے تھے۔ اب امیروں نے اپنی بستیاں الگ بسالی ہیں۔ پہلے عوامی نمائندے بھی انہی سکولوں میں پڑھتے تھے جہاں عام لوگ پڑھتے تھے۔ طلبہ یونین پر پابندی نے عام طبقات سے آنے والے رہنماؤں کا راستہ روک دیا' انتخابات دولت کا کھیل بن کر رہ گئے' پہلے سیاسی پارٹیاں اور لوگ کردار دیکھتے تھے اب دولت کے ڈھیر دیکھتے ہیں' اب جب بڑے سیاستدان عوامی محلوں میں رہتے نہیں' عام سکولوں کالجوں میں پڑھتے نہیں بلکہ بیرون ملک سے ڈگریاں لے آتے ہیں اور یہی وہ طرزِ عمل ہے جس نے انہیں عوام سے دور کردیا ہے۔ اس طرزِ عمل سے عزت کے معیار بدل گئے ہیں''۔

جناب مظہر برلاس صاحب! درج بالا سطور میں جن خیالات کا آپ نے اظہار فرمایا یقیناً حق اور سچ ہے اور یہ سچ اس وقت تک سچ ہی رہے گا جب تک قوم اپنے اس نعرے کا ادراک نہیں کرتی جو قیامِ پاکستان کا باعث بنا اور ایسا ادراک تب تک ممکن ہی نہیں جب تک ہم اس سیاسی نظام سے توبہ نہیں کر لیتے جس نے قوم کو بتدریج تباہی کے اس دہانے تک پہنچا دیا ہے اور آپ جیسے محبِّ وطن کالم نگار حالات کا نوحہ لکھنے پر مجبور ہیں۔ اس لیے کہ مروجہ پارلیمانی نظام محض انہی سرمایہ داروں کو مسندِ اقتدار تک پہنچاتا ہے جو نہ ہی بارگاہِ الٰہی میں اپنے اعمال کی جوابدہی کے بارے میں سوچتے ہیں اور نہ ہی ملک وقوم کی ترقی وخوشحالی ان کا مطمحِ نظر ہوتا ہے بلکہ منافقانہ سوچ کے ساتھ محض ذاتی مفادات میں فیصلے کرتے ہیں۔ اس لیے گزشتہ کئی عشروں سے اقتدار پر محض انہی چند خاندانوں کی اجارہ داری رہی ہے جن کی پہچان شرافت یا عہدے کی اہلیت نہیں بلکہ اقتدار کی ہوس اور ملکی سرمایہ کی لوٹ کھسوٹ ہے۔ اسی لوٹ کھسوٹ ہی کے برے اثرات ہیں کہ قوم تو جہالت اور غربت میں مبتلا ہونے کے ساتھ عالمی بینکوں سے لیے گئے سودی قرضوں کا بوجھ برداشت نہیں کر پا رہی اور گزشتہ کئی عشروں سے اقتدار پر باریاں لگانے والے بیرون ملک اپنے محلات میں براجمان اقتدار میں واپسی کیلئے ملک کے خلاف سازشوں کے نئے جال بچھانے میں مبتلا ہیں۔

ملکی تاریخ تو دیکھئے کہ ساٹھ کی دہائی میں جب صدارتی نظام نافذ تھا تو ملک تعلیمی، زرعی اور صنعتی لحاظ سے ترقی پذیر رہا اور جیسے ہی ایک سرمایہ دار کی زبانی روٹی، کپڑا اور مکان کا دلفریبی نعرہ بلند ہوا تو ملک پارلیمانی نظام کی طرف چل پڑا جس کی پہلی نحوست ملکی تقسیم اور دوسری نحوست بے لگام مزدور کے ہاتھوں صنعتوں کی بندش کی صورت میں سامنے آئی۔ آزاد خیالی کی صورت اسلامی اقدار پر حملے شروع ہوئے تو مذہبی رجحان رکھنے والے جنرل ضیاالحق مرحوم نے مارشل لاء کے بعد پارلیمانی نظام لپیٹ کر مجلسِ شوریٰ کے ساتھ صدارتی نظام نافذ کر دیا۔ خدائی حکمتیں کہ انہی دنوں گوادر کے گرم پانیوں تک رسائی کیلئے روسی دہریوں نے افغانسات پر حملہ کر دیا۔ یاد رہے کہ ان دنوں بہت سے پاکستانی دانشوروں نے روسی ریچھ سے پنگا نہ لینے کا مشورہ دیا لیکن جنرل ضیاء الحق کی ایمانی قوت نے افغان مجاہدین کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے نہ صرف افغانستان اور پاکستان کو روسی شکنجے میں کسے جانے سے بچا لیا بلکہ دیگر پانچ اسلامی ملکوں کے کروڑوں مسلمانوں کو بھی طویل عرصہ سے روسی استبداد سے آزادی کی نعمت سے نوازا۔ اسلام دشمن امریکی طاغوت کو جنرل ضیاء الحق کی اسلامی اتحاد اور جہاد کی کاوشوں کا ادراک ہوا تو طیارہ تباہی کی سازشی چال سے بہاولپور کے قریب شہید کروا دیا۔ اسکے بعد پاکستان میں صدارتی نظام کی جگہ ایک بار پھر سے پارلیمانی نظام کا نفاذ ہوا تو دو بڑی سیاسی پارٹیوں کو اقتدار پر باریاں لگانے کا موقع ملا لیکن افسوس کہ دونوں نے عوامی خوشحالی کی بجائے خاندانی اقتدار کا دوام مطمحِ نظر رکھا اور سیاسی ماحول میں ایک دوسرے کے خلاف محاذ آرائی کے ساتھ ملکی افواج کے خلاف بھی ریشہ دوانیوں کا سلسلہ جاری رکھا۔ چنانچہ ایک پارٹی کے سربراہ کی بھونڈی چال پر جنرل پرویز مشرف نے اقتدار پر قبضہ کر کے پھر سے صدارتی نظام نافذ کر دیا۔ افکار و کردار میں چونکہ جنرل ضیاء الحق کے بالکل ہی برعکس تھا اس لیے 9/11 کے بہانے امریکی طاغوت نے جب افغانستان پر حملہ کیا تو ہر لحاظ سے ان کا مددگار بن گیا۔ ملک میں اقتدار کی ایسی رسہ کشی دیکھتے ہوئے ہی ادارہ کشف الاحسان نے ''اسلام کا سیاسی نظام'' کے عنوان سے قسط وار مضامین شائع کرنے کا سلسلہ شروع کیا اور قرآن وحدیث کے حوالوں سے اسی بات پر زور دیا کہ بحیثیت مسلمان چاہیے کہ ہم قرآن وسنت میں غور وفکر کریں اور وہی سیاسی ومعاشی نظام اختیار کریں جو اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے اہلِ اسلام کیلئے پسند فرمائے ہیں اور جن کے عملی نفاذ سے بحیثیت قوم مسلمان صدیوں تک اقوامِ عالم پر غالب رہے ہیں۔ افسوسناک ہے کہ اکثر وبیشتر پاکستانی مسلمان آج بھی اسلامی نظام کی بجائے اسلام دشمنوں کے وضع کردہ سیاسی ومعاشی نظام پسند کر رہے ہیں اور ایمان کی بجائے منافقانہ طرزِ عمل کا کھلے عام مظاہرہ کر رہے ہیں۔ اسی لیے آج اندرونِ خانہ فکری وسیاسی انتشار کا شکار اور ایٹمی قوت ہونے کے باوجود عالمی حالات میں کوئی مؤثر کردار نبھانے میں انتہائی کمزور اور بے بس نظر آ رہے ہیں۔

اسلامی نظام لانے کی رکاوٹیں

.....سید قطب شہید

۱۔ سب سے بڑی رکاوٹ یہ ہے کہ دنیا کی ڈرائیونگ سیٹ پر کفر براجمان ہے یعنی دنیا میں کفر کا غلبہ ہے، مسلمان مغلوب ہیں۔

۲۔ دین پر دعوت دینے کی بجائے فرقے اور مسلک کا دور دورہ ہے۔

۳۔ اللہ ساختہ آئین یعنی قرآن عظیم کی بجائے انسان ساختہ آئین کو اپنایا گیا ہے۔

۴۔ علماء کرام نے دین حق کی بجائے امت کو فروعات میں الجھا رکھا ہے۔

۵۔ حکمرانوں کی تگ ودو اور سوچ عوام کی تگ ودو اور سوچ میں بعد المشرقین ہے۔

۶۔ حج میں محض طواف کعبہ کو ترجیح دی جاتی ہے، دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں کو اکٹھا کیے جانے پر زور نہیں دیا جاتا۔

۷۔ علماء کرام خلافت اور احیائے خلافت کا یوں جیسے ورق ہی پھاڑے ہوئے ہیں۔ منبر ومحراب اگر یکسو ہو کر نظام خلافت کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائیں ۔تو وہ نظامِ قیامِ خلافت یوں جیسے چند دن کی بات ہے۔

۸۔ ایسی دینی جماعت کی ضرورت ہے جو نفاذِ اسلام کے نعرے کو عملی جامہ پہنا دے ایسی جماعت سید قطب شہید کی Vision کے مطابق چند اوصاف کی مالک ہو۔ جسے صرف آخرت کی کامیابی کا فکر ہو۔ اس کے ارکان اس دنیا میں گزرنے والی زندگی کو مصیبت اور مشقت میں کاٹنے کے لیے تیار ہوں۔ تشدد اور ظلم برداشت کرنے کے لیے تیار ہوں۔ ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے آمادہ ہوں اس جہان میں وہ کسی اجر کے طالب نہ ہوں۔

۹۔ خرابیوں کی اصل جڑ حکومت کی خرابی ہے۔

۱۰۔ دین حق سے اصل انحراف لیکن نظروں سے اوجھل۔

۱۱۔ اسلام صرف کتابوں میں۔

۱۲۔ جمہوریت کی پرفریب آزادیاں۔

۱۳۔ ہماری مسلمانی مشکوک ہو چکی ہے۔

۱۴۔ مسلمانوں کے طرزِ عمل سے یوں جیسے اللہ ناراض ہے۔

۱۵۔ مسلمان ہونا گالی بن گیا۔

۱۶۔ ووٹ کی محتاجی۔